اے خدا-ایک تجزیہ

ڈاکٹر صفیہ عباد*

Abstract:

'Aye Khuda' is a book of prayers, which have been published at literary page of "The Daily Jang" on the first day of new year. These prayers depict the sorrows, loneliness, anger and dreams of writer which are directly related to the feelings of human beings. A New thing about these prayers is that they have a touch of literature, which triggers the detailed study of 'Aey Khuda'

مظہر الاسلام اردو کا ایک بڑا کہانی کار، موسموں کے رنگوں اور مزاجوں سے کھیلنے والا، آسمان کی بلندیوں پر قوس وقزح کے رنگ سمٹینے کے لئے اکثر زمین کی بساط بھی پلٹ دیتا ہے۔ اردو ناول نگاری کو نئی مغربی ٹیکنیک سے ہمکنار کیا۔ اُس کے اپنے عجائب خانے، اپنی بارشیں، اپنی دوپہریں، اپنی چھتریاں، حتیٰ کہ اپنی عبادت گاہیں ہیں۔ انہی عبادت گاہوں کی شیلف پر ''اے خدا'' رکھی ہوئی ہے۔ ''اے خدا'' کی دُعائیں اس وقت بھی پڑھنے کو ملتی تھیں جب نئے سال کا کیلنڈر اپنا نیا ورق پلٹتا تھا۔ جنگ اخبار کا ادبی صفحہ اس لمبی چوڑی دُعائیہ عبارت سے سجا ہوتا تھا۔ اور صفحے کے ماتھے پر ایک روٹھے ناراض چہرے والا مظہر الاسلام تصویر میں نمایاں ہوتا تھا۔ وہ ناراض کیوں ہے۔ تب بعد میں اس کا جواب اس وقت ملا، جب دوستوں کے لیے دوستی کی چمک آنکھوں میں سجائے وہ شہر والوں کے بغض وعناد پر پہروں بول سکتا ہے۔ یہی حال اسوقت ان دعاؤں کا بھی تھا۔ جہاں وہ ناراض تھا، عالمی سیاست کی شطرنج بازی سے، ملکی حالات کی ستم ظریفی سے، محبت کی مقدس دیوی کو لقمہ اجل بنانے والوں سے، غریب کی کٹیا، مفلس کی جھونپڑی، زلزلے، سیلاب، چور بازاری، رشوت ستانی، جھوٹ، مکاری، عیاری، بچوں کے ٹوٹے کھلونوں

* استاد شعبہ اُردو، ایف جی پوسٹ گریجوایٹ کالج راولپنڈی

گُم ہوتی ہوئی گُڑیوں، ویران شہروں حتیٰ کہ ان دعاؤں کے موسم اونچے چوباروں سے ہوتے ہوئے چڑیا کے دانے چوگ پر ختم ہوتے تھے۔

دُعا سب مانگتے ہیں۔ بندے اور خدا کے درمیان رابطے کا سچا اور مخصوص وقت ۔۔لیکن شاید کسی نے اس طرح سے اس فطری اور سچے وقت کی نبض پر ہاتھ نہیں رکھا، دعا کے ساتھ اپنے ازلی اور ابدی بندھن کو تلاش نہیں کیا، دُعا کے ساتھ اپنے سب سے پہلے تعلق کے لمحے کی ترجمانی نہیں کی، جس طرح اسے خدا مظہرالاسلام کی ترجمان بنتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مصنف نے جب ہوش سنبھالا، تو گھر آنگن میں صرف دعا کی آہٹ تھی، دعا کے بکھرے ہوئے رنگ تھے۔ دعا کی بارشیں تھیں۔ اور پھر اسی دعا نے مصنف کے قلم کی سیاہی میں بھی رنگ بھرنے شروع کر دیئے۔ دعا کے اس ابتدائی دور کے ساتھ گمشدگی کی ایک خاص روحانی کیفیت وابستہ ہے۔ جو قلبی واردات کے اسرار و رموز کا ایک حوالہ ہے۔

> ''انہی دنوں جب میرا باپ مجھے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر لے گیا، تو اس دن میں گُم ہو گیا تھا۔'' (۲)

مظہر کے ہاں روح ایک خاص داخلی اور روحانی کیفیت سے وابستہ ہے۔ روح کو کوٹنا، گوندھنا، تسخیر کرنا، حتیٰ کہ اندر اور باہر کی دنیا ایک ہو جائے اور ہاتھ میں پکڑا کوڑا مسلسل نفس پر برستا رہے۔ بچپن میں ایک امام مسجد جو بنیادی طور پر لوہار تھے۔ اور گھنٹیاں بنانے کا کام کرتے تھے۔ ان کی شخصیت اور شیشے کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے۔ کہ

> ''بات معلوم ہوگئی کہ گھنٹی کا بہانہ بنا کر دراصل وہ اپنی روح پر ہتھوڑے برسا رہے ہیں۔'' (۲)

اپنی روح پر ہتھوڑے برسانے، اُسے مسخر کرنے کا عمل تجربے کے طور پر مصنف کے ہاں بھی ہے۔ یہ اپنے اندر کی دنیا کو پانے کا ایک بہانہ ہے۔ خودی سے بے خودی کا ایک سفر ہے۔ ان سوالوں تک پہنچنا ہے جو باطنی کیفیت سے پھوٹ رہے ہیں۔ اسے یقین کے جادہ تک پہنچنے کی درمیانی حالت بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو اقرار و انکار اور ہونے سے نا ہونے کے درمیان متعلق ہے۔ مصنف کے سوانحی پہلو پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو شخصیت کے اندر یہ عناصر ابتدا ہی سے جڑ پکڑنے لگے تھے۔

> ''ایک بار میں نے اپنے آپ کو ایک صوفی بزرگ کے مزار کے احاطے میں دانہ چگتے ہوئے کبوتروں میں ڈھونڈا تھا۔'' (۳)

اپنی تلاش کے اس سفر میں پھر دعاؤں کا سہارا بھی لینا پڑا لیکن دعا کے پھول کو کھلنے کے لئے کس موسم کی ضرورت رہتی ہے؟ مظہر نے دعا کے پھول کے کھلنے اور اس کی اثر و تاثیر کے لئے غربت کے موسم کو سازگار قرار دیا

ہے۔مثلاً لکھتے ہیں۔

''ایک دن ہم سب بہن بھائی حسب معمول غربت اوڑھ کر پیار میں گہری نیند سو رہے تھے۔''(۴)

''غریب گھروں کا موسم دعا کی فصل کے لئے انتہائی سازگار ہوتا ہے۔''(۵)

یہی سے صوفیا کی محبت اور ان کی تعلیمات کی طرف اذہان پلٹتے ہیں۔

''اُن صوفی بزرگوں کی پرچھائیوں میں اپنے آپکو ڈھونڈ رہا ہو جنہوں نے اللہ کو پالیا تھا۔اب میں نے ان بزرگوں کی پرچھائیاں جوڑ کر اپنے لئے لباس سی لیا ہے۔''(۶)

''اے خدا'' میں بزرگان دین سے روحانی، قلبی اور جذباتی وابستگی کے کئی حوالے موجود ہیں۔ جو قلب کو ذات باری تعالی کی تجلیوں سے سرفراز کرتے ہیں۔اللہ تعالی کا فرمان ہے۔

''بہترین بندہ ہے۔جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔''(۷)

اگر یہ دیکھا جائے کہ اے خدا کا ماخذ اور خمیر کیا ہے۔دعاؤں کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے۔تو اس ضمن میں دو دھارے نمایاں طور پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ایک تو مصنف کی ذاتی زندگی جہاں دعاؤں کا ظہور آبشاروں کی مانند گرتا اور بکھرتا تھا۔دوسرے صوفیا کرام سے روحانی قربت کا پہلو،جس کی وجہ سے اے خدا میں اکثر بزرگان دین کے نام اور اقوال درج ہیں۔مثلاً حضرت رابعہ بصری، حضرت ذوالنون مصری، اور حضرت ابو یزید بسطامی وغیرہ لیکن یہ تمام حوالہ جات محض مطالعہ تک محدود نہیں۔ بلکہ ان کا سرا مصنف کی داخلی کیفیت سے بھی وابستہ ہے۔ جہاں مشاہدہ تجربہ بہت ہے۔احساس کی دنیا واردات قلبی کی امین بن جاتی ہیں۔

''اپنی شہ رگ تک پہنچنے کے لئے بھی تو بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فنافی الحق تک بڑے مقامات آتے ہیں۔معرفت کے لئے کئی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔''(۸)

معرفت، سلوک، ریاضت، چلہ اور اسی کے دیگر الفاظ تصوف کی دنیا کی محض اصطلاحات ہیں ان کو محض لفظی پیرائے میں بیان کرنا ہی کمال نہیں ہوتا بلکہ اے خدا کے حوالے سے جدت کا پہلو یہ ہے۔ کہ مصنف نے تصوف کی ان تمام اصطلاحات کو ادب کی مخصوص چاشنی کا ذائقہ بھی دیا ہے۔ایسا ذائقہ ایسا نشہ جو انسانی محسوسات کو ایک مخصوص انداز میں متحرک رکھتا ہے۔ایک ایسی تحریک کا موجب بنتا ہے۔ جہاں صرف تجرباتی دنیا کے نشیب و فراز ہی باقی رہ جاتے ہیں۔

''دل اگر واقعی دکھ سے بھر گیا ہے۔تو اب اس میں تھوڑی سی محبت اور تنہائی بھی ڈالو۔پھر سلوک کی تیز ہوا چلے گی دکھ کی بھٹی کی آگ بھڑکے گی، بوٹی مشک مچائے گی، محبت کا نشہ بڑھے تو سمجھنا دعا کا موسم آ گیا۔''(۹)

پھر دعا کے یہ موسم ''اے خدا'' کے ایوانوں میں واقعی سج گئے۔ دین اور دنیا کے حصول کے لیے کامیابی کی کنجی دعاؤں کی طاق پر رکھ دی گئی۔ اگر دیکھا جائے تو قدرت اللہ شہاب کی ''یا خدا'' سے مظہر الاسلام کی ''اے خدا'' کے اس ادبی سفر کا پس منظر ایک خاص معنویت کا حامل نظر آتا ہے۔ یا خدا نے ان گنت انسانی دکھوں کا کرب جھیلتے ہوئے جنم لیا۔ یہ کرب ایک مخصوص حادثاتی کیفیت کا عنوان تھا۔ ''اے خدا'' ان دکھوں سے نجات کی طالب بن کر ایک آفاقی سطح پر دعاؤں کا قالب اختیار کر گئی۔

عموماً کہا جاتا ہے اور بہت حد تک یہ درست بھی ہے۔ کہ خطوط انسان کی داخلی شخصیت کا اظہار اور آئینہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعا بھی خدا تعالیٰ کے حضور انسان کے خالص داخلی اظہار کا وسیلہ ہے۔ مظہر الاسلام کی کتاب ''اے خدا'' جو صرف دعاؤں پر مبنی ہے۔ اس میں جگہ جگہ مظہر الاسلام کی ذاتی زندگی خاندانی حالات وواقعات، بچپن کے ماہ و سال اور محسوسات و جذبات کی برساتیں اتری ہوئی ہیں آج کا قاری اور کل کا محقق با آسانی ان سے مدد لیکر مظہر کی سوانح مرتب کر سکتا ہے۔

سوانح میں جو فطری انداز ہوتا ہے۔ جو سچ اور سادگی اس کے ایک ایک نکتے میں بنی ہوتی ہے۔ جذبات کا جو بے روک دھارا ہوتا ہے اور ان کا جو انداز ہوتا ہے۔ ''اے خدا'' کی بنیاد انہی عناصر پر اُٹھائی گئی ہے جس طرح خط کو انسان مکمل طور پر فطری آزادی رغبت اور صاف گوئی سے لکھتا ہے۔ اسی طرح مظہر کی ''اے خدا'' ان دعاؤں کی سرگوشیوں، آنسوؤں کی مالاؤں دکھی دل کی فریادوں اور شکایتوں کی قوس وقزح سے سجی ہوئی ہیں۔ جیسے صرف اور صرف بندے اور خدا کے درمیان راز و نیاز کہا جا سکتا ہے۔ بندہ کیا چاہتا ہے کن کن معاملات پر کڑھتا اور دل گرفتہ ہوتا ہے۔ دکھ کی بارشوں میں وہ کس کی طرف رجوع کرتا ہے اور پناہ کا طلبگار رہتا ہے۔ اے خدا کا خمیر یہیں سے اٹھتا ہے۔

''اے خدا'' میں مظہر الاسلام کی ذات اپنے عہد کے تمام تر نشیب و فراز سے ہمکلام ہے۔ وزیر آباد کے کھیت کھلیانوں سے ماحول کے تارو پودے بنتے ہیں۔ آگے بڑھتے بڑھتے بات ذات سے نکل کر ماحول کے گرم و سرد سے الجھتی ہے۔ کیوں اور کیسا پر مبنی لب ولہجہ پورے عہد کا نباض بن جاتا ہے سرکاری بالا خانوں سے دعائیں گھومتی ہوئی سماجی زندگی کی بے اعتدالی معاشی تنگدستی، اخلاقی زوال اور رفتہ رفتہ عالمی تناظر کی دُھول میں گم ہو جاتی ہیں۔

اے خدا!
جنوبی افریقہ کے سیاہ فام عوام نے
ماہ و سال کی تیرگی میں
لہو کی فصل پک گئی ہے

اے خدا۔ایک تجزیہ

نجمن مولائس کی پھانسی
اب ہری ہوگئی ہے
ان میں نیلسن منڈیلا آباد رکھنا۔

لیکن اس طرح سے کہ ذاتی احساسات وجذبات کا رنگ کہیں بھی مدھم نہیں ہونے پاتا۔یہی پہلو ''اے خدا'' میں مصنف کی سوانح اور اس کی شخصیت کے پرت در پرت کھولتا جاتا ہے۔یہ شخصیت کی عکاسی کا انتہائی فطری انداز ہے روزمرہ معمولات زندگی میں فطرت کے جو نمایاں پہلو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔اس انداز سے نمایاں ہوجاتے ہیں۔

''رونا مجھے بے حد پسند ہے۔تنہائی، اداسی اور رونا میرے پکنک سپاٹ ہیں۔رونے سے روح دُھل جاتی ہے ذات کی نفی ہوتی ہے۔''(۱۰)

اندر کی حساس اور دکھی دنیا خارجی معاملات زندگی سے ہم آہنگ ہوکر زندگی سے کچھ اور قریب ہوجاتی ہے۔

''انہی دنوں میں کبھی کبھی مختلف گھروں سے حافظ صاحب کے لئے روٹی لایا کرتا تھا۔
یہ بھی اپنی روح کو سلامت کی بھٹی میں جھونکنے سے کم نہ تھا۔''(۱۱)

اندر اور باہر کی دنیا کے رنگ باہم کچھ اس طرح سے غلط ملط ہونے لگتے ہیں۔کہ رفتہ رفتہ ''اے خدا'' میں مصنف کا احساس تنہائی اللہ پر توکل، قناعت، راست گوئی اور شخصیت کے دیگر گوہر آبدار سوانحی پہلو کو بھرپور طریقے سے تشکیل دیتے ہیں۔صوفیا کرام کی داخلی زندگی کے نمایاں اوصاف کا خمیر اسی احساس تنہائی، راست بازی اور توکل الٰہی کا غماز ہے۔اپنے اندر رب جلیل کی آہٹ کو محسوس کرنا اور اسی آہٹ کی ہلکی ہلکی سرگوشی پر کان دھرتے زندگی اور موت کا سچ تلاش کرتا ہے۔

''جب انسان اپنے رب کو پہچان لیتا ہے پھر مشکل آسان ہوجاتی ہے اس کے اندر حوصلہ اور اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔پھر زندگی یا موت کا مسلہ نہیں رہتا۔دونوں سفر ایک جیسے ہوجاتے ہیں''(۱۲)

زندگی اور موت کی حقیقت کی تلاش کرنے والوں نے سب سے پہلے اپنے وجود کے قلعے تسخیر کیے، اپنی تلاش کے سفر میں جو جیتے وہی فاتح ہوئے۔لیکن ایسا فاتح کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔اندر کی دنیاؤں کو تسخیر کرتے کرتے وہ مسلسل ایک لذت پیکار سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔وہ تڑپ، وہ لذت جو بندے اور خدا کے درمیان ایک رابطہ ایک تعلق ہموار کرتی ہے۔

''اپنے آپ کو ڈھونڈے بغیر کچھ نہیں ملتا ہے۔''(۱۳)

اور اگر اس تلاش میں ناکام ہوئے تو سوال پیدا ہوتا ہے۔

''اپنے آپ کو نہیں ڈھونڈ سکتے تو خدا کو کیسے پاؤ گے۔''(۱۴)

گویا ''اے خدا'' میں یہ داخلی کیفیت ارتقائی انداز میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔

''اے خدا'' کی ایک اہم خصوصیت جو اسے آفاقی، تاریخی اور عالمی منظرنامے سے وابستہ کرتی ہے وہ اس کی دعاؤں میں شامل لحہ بہ لحہ ملکی اور عالمی سطح پر نئے حالات وواقعات کا ردوبدل ہے۔ مصنف اس ردوبدل کو رقم کرتے ہوئے دعا کے ایک مخصوص مزاج سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ دعائیں ہیں۔ جنھیں پڑھ کر ادب کا قاری پوری طرح سیاسی سماجی اور معاشی سطح پر انسانیت کے خدائی خدمت گاروں کا اصل چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ ''اے خدا'' کا یہ طریقہ کار تاریخ کا ایک ورق بن کر ادب کا حصہ کہلائے گا۔ ''اے خدا'' دعاؤں کی علمبردار بن کر پوری طرح اپنی روحِ عصر سے عبارت ہے۔ روحِ عصر جس کی نبض پر مصنف کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔

''اے خدا!

سال ۹۰ء نے

اپنا سارا وقت ایوانِ صدر میں گذارا

وہ سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا رہا''۔

گویا مصنف کی نگاہ اپنے ماحولیاتی مطالعہ سے پوری طرح بہرہ ور ہے

''وقت کی تنگ گلی میں

اس کے پچھلے

حریصی اور لالچی

سیاست دانوں

دانشوروں اور شاعروں کی بھیڑ تھی''۔

اسی طرح ایک اور جگہ مصنف لکھتا ہے۔

اے خدا!

کراچی کو کیا ہوا

لہو سے لکھی گنجان گلیوں میں

مردہ دوپہروں اور شاموں کا انبار ہے

صبح ماتمی لباس پہنے
آنکھوں کے مزار سے اُٹھ کر ابھی ابھی اشکوں کی فاتحہ خوانی کے لئے گئی ہے۔

دنیائے عالم کا ہمیشہ سے سب سے بڑا مسلہ بھوک اور افلاس رہا ہے۔ یہ نہ صرف انسان کے اندر شرف انسانیت کو داغدار کرتا ہے۔ بلکہ اس سے انسان کی تمام تخلیقی جمالیاتی صلاحیتیں بھی شدید متاثر ہوتی ہیں۔کوئی سماج اتنے بڑے اور بنیادی مسئلہ کے ساتھ نہ تو امن وامان کو قائم رکھ سکتا ہے۔اور نہ معاشرے میں انسانی اقدار کوفروغ مل سکتا ہے۔ معاشی مسائل اقوام کو گُھن کی طرح چاٹ کھاتے ہیں۔عمومی طور پر ادب کی اصناف میں کہانی ایک ایسی صنف ہے۔ جس میں اس طرح کے موضوعات کو بخوبی سمیٹا اور پیش کیا گیا ہے۔لیکن مظہرالاسلام نے دعا کے پیرائے میں ان مسائل کونہایت جامعیت اور حُسن وخوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کچھ اس طرح سے کہ دعا کا پیرائیہ بیان ذات سے نکل کر کائنات کی وسعتوں کو چھوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ مسئلہ یہاں پر صرف کسی ایک ملک وقوم سے وابستہ نہیں۔ بلکہ عالمی سطح پر اس کے بھیانک ثمرات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہاں مُفلسی غریب کی لاوارث کٹیا سے نکل کر مفلس، مظلوم اقوام کے حسب ونسب کو بھی داغدار کر رہی ہے۔مصنف نے اس امارت اور اختیار کا بھی یہاں محاسبہ کیا ہے۔ جو فرد اور ملک دونوں کوشرف انسانیت سے گرا رہی ہے۔اسی کے باعث آج مفلس اور غلام قوم سپر طاقتوں کی زرخرید بن گئی ہے۔ مانگنے کا نوالہ فرد کے لئے ہو یا قوم کے لئے دونوں لحاظ سے باعث ننگ وعار ہے۔''اے خدا'' کی دعاؤں میں مصنف محنت کش کے خون پسینے کے دکھ سمیٹتا ہے۔

یا خدا!
میرے میرے محنت کشوں کو
آٹے اور دال کا بھاؤ ڈراتا ہے۔

آج پوری روح کائنات اسی آٹے دال کے بھاؤ سے عالم خوفزدگی میں ہے، کہتے ہیں۔کہ تمام دنیا کے لکھاریوں کے قلم سانجھے ہوتے ہیں۔ وہ انسانیت سوز نہیں بلکہ ''انسانیت ساز'' لکھتے ہیں۔ان کے قلم کے رتجگے میں دکھ کے موسم اور محبت کی آنچ میں پگھلتی قلم کی سیاہی بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔''اے خدا'' کو جہاں ملک گیر پذیرائی ملتی رہی، وہاں ہندوستان کی مایہ ناز لکھاری امرتا پریتم نے بھی ''اے خدا'' کی ادبی، فنی وفکری روح پر مضامین لکھے۔امرتا اعلی پائے کی لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی پارلیمنٹ کی رکن بھی تھیں۔اپنی تحریر وتقریر میں مظہرالاسلام کی ان دعائیہ نظموں کوبطور حوالہ استعمال کرتی تھیں۔اپنے ایک خط میں مظہرالاسلام کو لکھتی ہیں۔

''میں آپکی نظم ۱۹۸۵ء کی پہلی دعا اپنی کتنی ہی تقریروں میں کوٹ کرتی رہی لیکن پھر بھی تسلی نہ ہوئی پچھلے

دنوں اس نظم پر ایک آرٹیکل لکھا جو اس ہفتے ہندوستان کے سب سے بڑے ہندی ویکلی میں چھپا ہے۔‘‘(۱۵)

مظہر اور امرتا کا یہ ادبی روحانی رابطہ درحقیقت دوملکوں کے دو ادیبوں کے مشترکہ دکھوں اور حساس دل کی کیفیتوں پر مبنی ہے۔ ’’اے خدا‘‘ کا ورق ورق سماج کے دکھوں کی دستاویز بن گیا ہے۔ اس لئے کہ مصنف ان انفرادی اور اجتماعی دکھوں اور محرومیوں پر کڑھتا ہے۔ اور دعا کے نت نئے پیرائے اختیار کر کے معاشرے اور خود زندگی کے پیرہن سے ان معاشی محرومیوں کا داغ دھونا چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ پرندوں، چڑیوں اور سارے پنکھ پکھیرو کے لئے دانہ چوگ کی دعا کرتا ہے۔ اس دعا میں رفتہ رفتہ امرتا پرتیم کی روح بھی شامل ہوجاتی ہے۔ وہ مظہر کے نام اپنے خط میں لکھتی ہیں۔

’’آپ کی ۱۹۸۵ء کی پہلی دعا خدا کو قبول ہوجائے۔ تو بہت ہی اچھا ہو۔ ہم لوگوں نے ۱۹۸۴ء کا روپ بڑا بھیانک دیکھا ہے۔ آپ کی یہ نظم اتنی خوبصورت ہے۔ کہ اس کی کئی سطریں میں اس سال اپنی تقریروں میں بھی شامل کروں گی۔‘‘(۱۶)

مظہر کے نام امرتیا کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان خطوط کے ذریعے ہمیشہ ’’اے خدا‘‘ کی دعاؤں کو ستائش وعقیدت کے تحفے بھیجتی رہیں۔

’’اے خدا‘‘ کی ایک اہم خوبی اپنے عہد کے ہنگامی موضوعات کا احاطہ کرنا ہے۔ یہاں ملکی اور عالمی سطح کے ہنگامی مسائل کو دعائیہ پیرائے میں رقم کیا گیا ہے۔ کسی بھی ملک وشہر کا انقلاب، عروج وزوال، قحط، زلزلے، سیلاب مصنف کی اس عالمگیر تباہی پر گہری نظر ہے۔ ’’اے خدا‘‘ کا قاری جب بھی اس کا مطالعہ کرے گا تو ماہ وسال کے اعداد وشمار سے بخوبی اس بات کا تعین کر سکے گا۔ کہ اس کرہ ارض پر کہاں اور کون سی آفات آئیں۔ یہاں دعا کا پیرائیہ بیان بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہوجاتا ہے۔

اے خدا!
کشمیر اور بونیا
سزا یافتہ دنوں کے طاق پر رکھے
لہو کے چراغ سے پگھلتی تتلیاں

اے خدا!
مہاراشٹر میں زمین نے زہر اگلا

اے خدا!
وہ وقت اب بھی چوک میں کھڑا ہے

اوجڑی کیمپ کے میزائلوں نے تار تار کیا۔

اے خدا کی دعائیں ایک خاص قسم کی روحانیت، بے غرضی اور بے لوثی سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ان میں دردانسانیت کے ساتھ مصنف کی شدید وابستگی نظر آتی ہے۔بعض مواقع ایسے آتے ہیں۔ جہاں روح عالم ارواح سے راز و نیاز میں مصروف نظر آتی ہے۔

''دعا بھی تو ایک دھاگہ ہے جس سے اللہ اور بندے کا تعلق سلتا ہے''(۱۷)

دعاؤں کے اس دھاگے کی کرامت صوفیا کرام کے یہاں ہمیشہ بڑے بڑے معجزوں کی صورت بارش بن کر برستی رہی۔

دعا میں آہ نیم شبی کا پہلوا کثر صوفیا کرام کی کٹیاؤں اور ریاضت کی چکی سے وابستہ ہوتا ہے۔آہ نیم شبی کی دعائیں روح کی کائنات سے بلبلاتے ہوئے جنم لیتی ہیں۔نہائے ہوئے سویروں میں ایسی دعاؤں کو چپ لگ جاتی ہے۔ لیکن رات کی تاریکی اور تنہائی میں اس چپ کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ان دعاؤں میں بے قراری، بے اختیاری اور جذبات کا زیروبم ہی باقی رہ جاتا ہے۔مصنف عالم بے خودی میں دعاؤں کے اس نور کو اپنے گھر کے آنگن سے لیکر نکلتا ہے۔وہ نور وہ روشنی جو سفر حیات میں اس کے ہمراہ رہی۔

''اندھیری کوٹھڑی میں سے میرے باپ کی اللہ میاں کے حضور گڑ گڑا کر دعا مانگنے کی آواز میری نیند میں کسی پھول کی طرح کھل اُٹھی۔''(۱۸)

دعا کا پھول ہر لحاظ سے انسان کو ادب وآداب کا عادی بناتا ہے۔جینے کا سلیقہ اور مرنے کی لذت سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ آداب اور سلیقہ تخلیق ادب میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔کیوں کہ تخلیق کا سرچشمہ روح سے پھوٹتا ہے۔یہیں پر ایک سمجھ، ایک شعور بیدار ہوتی ہے۔کہ زندگی کے ترجمان اس ادب کو کیسے اور کیوں کہ ایک ہنر تناسب اور توازن کا امین بنایا جائے۔اے خدا میں اکثر مقامات پر مصنف کا واضح پیرائے میں ان تخلیقی حدود اور حسن نظر پر اظہار خیال ملتا ہے۔مصنف لکھتا ہے۔

بُری کہانی مختصر ہونی چاہیے
اور اچھی اس سے بھی مختصر

کہانی کی تخلیق کے لئے اتنی مختصر اور اتنی جامع تعریف شاید ہی ممکن ہو سکے۔اے خدا میں موسموں کی شدت لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہے۔مصنف کی دعاؤں کے بدلتے زاویوں میں ایک دعا فن اور فنکار کے لئے بھی مخصوص ہو جاتی ہے۔

اے خدا!

۱۹۹۴ء جاتے ہوئے
خودکلامی کی بیاض بھی لے گیا
پروین شاکر
محبت،خوشبو
خواب، ہوااور آنکھیں لکھتی رہتی تھی
شاید وہ لفظوں کا بھیس بدل کر
کسی کہانی میں آئے
امرتیا کی کوئی نظم بن جائے

مصنف کی دعاؤں میں جوں جوں روانی اور شدت کا پہلوزور پکڑتا جاتا ہے۔تو ایسے ادیبوں اور فنکاروں کے ناموں اور کاموں کے حوالے شامل دعا ہوتے جاتے ہیں۔جن کا کسی نہ کسی ادب کے حوالے سے بڑا نام ہے۔ایک طرف ان عظیم ادبی ناموں کے لئے مصنف کا یہ خراج عقیدت ہے تو دوسری طرف مصنف کا ادبی ذوق اور وسیع مطالعہ فن اور فنکار کی قدریں متعین کرتا ہے۔

اے خدا!
دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو
سچائیاں لکھنے کا حوصلہ عطا کر
امرتا، گیبرائیل گارسیا اور میلان کنڈیرا کی تحریروں میں
سچ کے ذائقے کی تلخی برقرار رکھ۔

''اے خدا'' کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ اس نے ''دعا'' کو بطور ایک صنف ادب متعارف کروایا ہے۔ادب کیا ہے؟ یہ ذات سے کائنات،ازل سے ابد، حیات سے ممات تک کے سفر میں اپنے راستے کی تمام وسعتیں عبور کرتا جاتا ہے۔زندگی سے جڑا ہوا اور زندگی سے ماوراء بھی ہے۔مکاں لامکاں سب اس کی زد اور اس کی دسترس میں ہیں اسکا بنیادی تعلق آفاق کے ساتھ ہے۔''اے خدا'' زندگی کے حقائق اور گردش چمن سے پوری طرح وابستہ ہے۔

یا خدا!
دس سال پہلے
میں نے سال کی پہلی دعا

لکھنی شروع کی تھی
مگراب ادب کی
اس نئی صنف کی قطاریں
اور بھی ہیں۔

''اے خدا'' میں ادبیت کی ایک اورشان اسکا خالص ادبی لب ولہجہ ہے بہاروں کے رنگ، دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں، بارشوں کی رم جھم، ہواؤں کے جل ترنگ دعائیہ لب ولہجہ کے لئے سرخی وغازہ کا کام دیتے ہیں۔ برمحل الفاظ کا چناؤ، محاورات، تشبیہات واستعارات دعا کے ادبی رنگ کوجلا بخشتے ہیں

مظہرالاسلام کی دعائیں اپنی کہانی کی دوشیزہ اس کی چوڑیوں، حنائی ہاتھوں، ہجر کی طویل تاریک راتوں کو بھی نہیں بھولتیں۔ وہ اپنی کہانی کی سوگوار انتظار میں ڈوبی چڑیا کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ بچوں کے ٹوٹے کھلونوں اور نت نئی چیزوں کیلئے مچلتے ہوئے دل کو بھی یاد رکھتا ہے۔تپتی ہوئی دھوپ میں محنت کش کے پاؤں کے چھالے اسے ستاتے ہیں۔ وہ پھولوں، بارشوں، تتلیوں اور پرندوں کے دکھوں کی دوری کے لئے بھی دعا مانگتا ہے۔ یہ انداز''اے خدا'' کے دعائیہ رنگ کو ایک منفرد اور دلکش اسلوب عطا کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں دعا میں ادبیت کی چاشنی بھرنے لگتی ہے۔

اے خدا!
چرخے پر کاتے ہوئے گیت میں
چرواہے کا دل بولے۔
اے خدا!
محبت کو کیا ہوا
سنا ہے یہاں
کبھی وفا کا دریا بھی بہتا تھا۔
اے خدا!
آنے والے سال کو
مہربان موسموں کی شال دے
اے خدا! اس سال اپنے پہاڑوں کو

چرواہوں کی دوستی کے گیت کی محبت میں مبتلا رکھ۔
اے خدا!
بنیائی سے محروم بچوں کی آنکھوں کو روشنی سے لکھ
ان بچوں کے سکولوں کی راہ داریاں
میرے دل سے ہو کر گذرتی ہیں۔
اے خدا!
میری نظر ڈری ہوئی چڑیا کی طرح
بچی کے چہرے پر پھیلے
گھنے سناٹے میں پھڑ پھڑا کر اڑی،

''اے خدا'' کا ایک اہم پہلو اسکا مستقبل کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جانا ہے۔ کہ مصنف آنے والے دنوں کو غم والم اور محرومیوں کی دھول سے بچانا چاہتا ہے۔ نئی زندگی اور نئے سماج کی آرزو اس کی دعاؤں کا مرکز اور محور ہے۔ یہ نئی زندگی اور نیا سماج اس کرۂ ارض پر کوئی بھی اور کہیں پر بھی واقع ہوسکتا ہے۔ کسی بھی عقیدے کا حامل دکھی اور حساس دل یہ دعا کرسکتا ہے۔

اے خدا!
محبت ڈھونڈنے والے
ہتھیلیاں کھول کر
ہجر کی تحریر پڑھتے ہیں
ہر سطر کی لمبی رات کے سفر سے ڈرتے ہیں
وہ کب آئے گا۔
اے خدا!
وہ وعدہ رنگ شام
آخر کب آئے گی
جو پرندے کو
اجنبی ہوا کی گرہ سے کھول کر لائے گی۔

دعا کا یہ انتظار بڑھتا جاتا ہے۔اس میں شدت اور نئے دنوں کی آس کا رنگ شامل ہو جاتا ہے۔

اے خدا!
امید کا کوئی نیا پھول
کوئی نیا قہقہ
کوئی نئی آواز
کوئی نیا چاند ٹانک دے۔
اے خدا!
خوش رنگ پھول اُگا
حق تلفی کی لمبی دوپہروں میں
انہیں تسلی کی چھتری عطا کر۔

اے خدا کا ایک اہم ترین موضوع موت ہے۔زندگی کی سب سے بڑی حقیقت۔اہل قلم کی دنیا ہو یا فلاسفروں کی نکتہ سنجیاں ،صوفیائے کرام کی چلہ کشی ہو یا علماء کا فکر و تدبر موت ہر ہر پہلو سے موضوع بحث ان کے لئے پر کشش اور خوبصورت رہی ہے۔''اے خدا''میں موت کا تذکرہ بڑے مثبت اور توانا پیرائے میں سامنے آیا ہے۔

اے خدا!
موت
دھیمی اور خوبصورت ہے
خاموشی سے بات کرتی ہے۔
اور شبنم کی طرح
بدن کے پھول کو
بھگو دیتی ہے۔

موت کا موضوع یہاں ذات سے کائنات کی طرف رفتہ رفتہ گامزن ہوتا جاتا ہے۔یہ موضوع اہل فکر اور صوفیائے کرام کے یہاں ہمیشہ پسندیدہ اور اہم رہا ہے۔اور اگر دیکھا جائے تو موت نے ایک حاکم اعلی بنکر کائنات کے چپے چپے پر حکمرانی کی ہے۔مصنف کا دل بھی اس کی محبت اور کشش سے مالا مال ہے۔

''میرے دل کے کسی گوشے میں اب بھی موت کی محبت موجود ہے۔زندگی کی طرح موت بھی خوبصورت

ہے۔''(۱۹)

موت سے متعلق مصنف کا یہ انداز اور نقطہ نظر ایک انتہائی مثبت اور توانا سوچ کا آئینہ دار ہے۔ جہاں موت انسان کو زندگی کی طرح ہی عزیز اور قابل قبول ہے۔

مظہر کی ''اے خدا'' میں جہاں بطور صنف ادب ایک جدت کا پہلو آیا ہے۔ وہاں اس کتاب کے تعارف، انتساب اور دیباچے میں بھی جدت کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی ہوئی ہے۔ مثلا

''آنسوؤں کے پھولوں کے موسم میں آنکھیں کیوں ہجرت کر جاتی ہیں۔''(۲۰)

اللہ تعالی کے نام انتساب لکھتے ہوئے مصنف اپنے نام کے ساتھ لکھتا ہے۔ ''حال مقیم زمین''

اسی طرح فہرست میں عنوانات کا انتخاب کچھ اس طرح سے سامنے آتا ہے۔

''بھیگی آنکھوں میں اُڑتی، میرے قتل کا آیا، دروازوں پر جمی دستک، نئی اور پرانی قبروں کے، قدموں کی چاپ میں مسافر، دعا------ محبت اور دکھ کے موسموں کا پھول'' وغیرہ۔

''اے خدا'' صرف سال بہ سال دعاؤں کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہر سال ہر ملک وقوم کی ایک تاریخی، سماجی وادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ دیگر اوباء کی طرح امریتا پریتم نے نہ صرف ہندی اور پنجابی زبانوں میں ان دعاؤں کے تراجم کیئے۔ انہیں اپنی تحریر وتقریر میں برتا، ان پر مضامین لکھے۔ بلکہ انگریزی زبان میں بھی ان دعاؤں کے تراجم کے ساتھ ساتھ مضامین کا سلسلہ جاری وساری رکھا۔ جدید پیرائیہ بیان میں وہ نئے سال کے نئے پس منظر میں ان دعاؤں پر مبنی نظموں کی منتظر رہیں۔ ان نظموں اور دُعاؤں کی بازگشت پر پلٹ کر دیکھتی اور ان الفاظ میں خود سے مخاطب ہوتی ہیں۔

(۲۱)''who is standing on the necked flour of the new year.''

اس علامتی طرز بیان میں وہ نئے سال کے ننگے فرش پر وہ مظہر کو دست بدعا دیکھتی ہیں۔ ''اے خدا'' ان گنت شعری ادبی، تاریخی، سیاسی وسماجی اور سوانحی خصائص سے مالا مال ہے۔ اس پر مزید تحقیق یقیناً ادب کے اُفق پر نئے فکری محاسن متعارف کروائے گی۔

حوالہ جات

ا۔مظہرالاسلام،اے خدا سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۹ء،ص۱۲

۲۔ایضاص۱۱

۳۔ایضاص۱۲

۴۔ایضاص ۷

۵۔ایضاص۸

۶۔ایضاص۲۱

۷۔حضرت سید علی بن عثمان الہجوری کشف المحجوب، الفیصل لاہور،۲۰۰۶ء ص۳۳۷

۸۔مظہرالاسلام،اے خداء ص۱۴

۹۔ایضاص۲۱

۱۰۔ایضاص۱۵

۱۱۔ایضاص۱۱

۱۲۔ایضاص۲۰

۱۳۔ایضاص۲۱

۱۴۔ایضاص۱۴

۱۵۔امریتاپریتم، خط بنام مظہرالاسلام،۱۹۸۵ء

۱۶۔ایضا۱۹۸۶ء

۱۷۔مظہرالاسلام،اے خدا،ءص۹

۱۸۔ایضاص ۷

۱۹۔ایضاص۲۰

۲۰۔ایضا ٹائیٹل

۲۱۔امرتیاپرتیم، خط بنام مظہرالاسلام، بتاریخ ۱۹۸۸ء

❀......❀......❀